محمد عطاء اللہ صدیقی

انگریز خواتین اور تحریکِ نسواں

اگر چہ اقوام متحدہ نے ۸/ مارچ کو ہی عورتوں کا عالمی دن قرار دیا ہے، مگر این جی اوز کے عالمی نیٹ ورک نے آہستہ آہستہ مارچ کا پورا مہینہ ہی عورتوں کے حقوق کی 'جدوجہد' کے نام کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور پریس اس مہینے میں آزادئ نسواں کے حوالہ سے جس قدر پراپیگنڈہ کرتے ہیں، اس کا تناسب دیگر گیارہ مہینوں کے اجتماعی پراپیگنڈہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں کیونکہ این جی اوز کی بعض سرگردہ بیگمات وزارتوں پر متمکن ہیں اور مردوزراء کی بھی اچھی خاصی تعداد 'لبرل' ہونے کے ناطے این جی اوز کے ایجنڈے کی مؤید ہے، اسی لئے امسال حکومت پاکستان نے مارچ کے دوسرے ہفتے کو سرکاری سطح پر عورتوں کے حقوق کے ہفتے کے طور پر منایا۔ پاکستانی ٹیلی ویژن اور انگریزی اخبارات اور سیکولر اردو اخبارات نے آزادئ نسواں کے متعلق تفصیلی پروگرامات پیش کئے اور خصوصی ایڈیشن نکالے۔ این جی اوز کے تنخواہ دار محققین کی فوج ظفر موج نے شاندار دفاتر کے مخلوط جمالیاتی ماحول میں بیٹھ کر پاکستانی خواتین کی 'حالتِ زار' کے متعلق جو رپورٹیں مرتب کی تھیں، ان میں پیش کردہ خودساختہ اعداد وشمار کو مستند حوالہ جات کے طور پر پیش کیا گیا۔ آج تک حکومت پاکستان تو خواتین کی تعلیم وصحت کے متعلق کوئی جامع، قابل اعتبار اور مستند رپورٹ مرتب نہیں کر سکی، مگر ہماری این جی اوز کا ہر دفتر ایسی رپورٹوں سے مزین نظر آتا ہے۔ پاکستانی خواتین کی سماجی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو این جی اوز کے ذوقِ تحقیق کا تختۂ مشق بننے سے اب تک محفوظ رہا ہو۔

راقم الحروف گذشتہ برس انہی دنوں شائع ہونے والے اپنے تحقیقی مقالہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کر چکا ہے کہ امریکہ میں 'مساوی حقوق کی آئینی ترمیم'، آج تک منظور نہیں کرائی جا سکی۔ اس ترمیم کی حمایت اور مخالفت میں ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک امریکہ میں ایک زبردست سیاسی جدوجہد دیکھنے میں آئی۔ ترقی پسند، روشن خیال، اور لبرل فکر کے حامل خواتین وحضرات نے امریکی ریاستوں کی توثیق کے لئے مطلوبہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے بھرپور انتھک تحریک چلائی، مگر انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ عورتوں کے حقوق کے لئے آئینی ترمیم کی تحریک کی نمایاں ترین بات یہ ہے کہ اسے ناکام بنانے میں رجعت پسند یا قدامت پسند مردوں کا کوئی خاص کردار نہیں تھا، حقیقت میں اس مساوی حقوق کی تحریک کو ناکام بنانے میں امریکی عورتوں کی خاموش اکثریت نے بھرپور کردار ادا کیا۔ یہ وہ عورتیں تھیں جو مساوات مرد وزن کو اپنے لئے نقصان دہ سمجھتی تھیں، ان کا خیال تھا کہ اگر عورت ہر معاملے میں مرد کے 'برابر' حقوق حاصل کر لے، تو وہ ان اعزازات اور عنایات سے محروم ہو جائے گی جو اسے سوسائٹی نے صدہا برس سے محض 'عورت' ہونے کی وجہ سے عطا کر رکھی

ہیں۔انہیں یہ بھرپور احساس تھا کہ وہ کسی بھی طور مردوں کا زندگی کے مختلف میدانوں میں مقابلہ نہیں کرسکتیں جب تک کہ انہیں خصوصی مراعات نہ دی جائیں۔وہ لبرل عورتوں کی خاندانی نظام کی مخالفت کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔انہوں نے خاندانی نظام کے تحفظ کے لئے بھرپور تحریک چلائی۔

امریکہ میں مذکورہ آئینی ترمیم کی اب تک توثیق نہ ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہے کہ تحریک نسواں (Feminist Movement) کو عام امریکی عورت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہ جدید عورتوں کی ایک متحرک اقلیت ہے جو ذرائع ابلاغ میں غیر معمولی پراپیگنڈے کے زور پر اپنے نظریات کو پھیلا رہی ہے۔عام پاکستانی جو امریکی معاشرے کے بارے میں محض وہی علم رکھتا ہے جو ذرائع ابلاغ سے اسے حاصل ہوتا ہے، ہمارے اس دعویٰ پر مشکل سے یقین کرے گا۔اگر علم کی بنیاد CNN یا سنسنی پھیلانے والے یہودی ذرائع ابلاغ کو ہی سمجھا جائے تو پھر یہ مغالطہ ضرور لاحق ہوتا ہے کہ امریکہ یا یورپ کی سو فیصد عورتیں جدید تحریکِ نسواں کی حامی ہیں مگر حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔اب ایسی کتابوں کی بھی کمی نہیں ہے جن میں خاندانی نظام کی تباہی کا ایجنڈا رکھنے والی نام نہاد تحریک نسواں کی مخالفت میں مؤثر مواد دیکھنے کو ملتا ہے۔راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں مغربی مصنفین کی کم از کم ایک درجن ایسی کتب موجود ہیں جن میں تحریکِ نسواں کے خطرناک نتائج پیش کئے گئے ہیں۔مگر اس وقت راقم الحروف ان کتابوں کے اقتباسات نقل کرنے کی بجائے برطانیہ سے آئی ہوئی دو انگریز خواتین سے ملاقات کے حوالہ سے اپنی بات آگے بڑھانا چاہتا ہے۔یہ خواتین کون تھیں اور ان سے تفصیلی ملاقات و مکالمہ کی صورت کیسے پیدا ہوئی، اس کا تذکرہ دلچسپ بھی ہے اور راقم کے لئے روحانی خوشی کا باعث بھی۔

۱۱ر مارچ ۲۰۰۱ء سے لے کر ۱۹ر مارچ ۲۰۰۱ء کے دوران راقم الحروف نے چند افراد کے ساتھ صوبہ سرحد کا مطالعاتی اور تفریحی دورہ کیا۔۱۶ مارچ کو ہم لوگ پشاور سے طورخم کی طرف عازمِ سفر ہوئے۔اتفاق سے اسی دن سری لنکا کے وزیراعظم بھی طورخم کے دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ان کی آمد کی وجہ سے سیاحوں اور دیگر مسافروں کو طورخم سے تین کلو میٹر پہلے مچنی (Michni) چیک پوسٹ پر روک لیا گیا۔ہم لوگ اس مقام پر گاڑی سے اتر کر ایک بلند پہاڑی پر کھڑے ہو کر دوربین سے طورخم بارڈر کو دیکھ رہے تھے۔فرانس، وسط ایشیا اور یورپی ممالک سے پاکستان آئے ہوئے کچھ خواتین و حضرات کو بھی یہاں روک دیا گیا تھا وہ سب ہمارے ساتھ ہی کھڑے ہو کر دوربینوں کے ذریعے پاک افغان سرحد کا نظارہ کر رہے تھے ان کے ہمراہ گائیڈ انہیں نہایت توجہ سے تفصیلات سمجھا رہے تھے۔اسی دوران دو غیر ملکی خواتین کو پاکستانی لباس میں دیکھ کر قومی ثقافت کے متعلق میری پسندیدگی کے جذبات کو یک گونہ تقویت ملی۔ مجھے ہی نہیں وہاں پر موجود کئی پاکستانی نوجوانوں کو بھی ان خواتین کی یہ ادا بھلی لگی۔کئی نوجوانوں نے انہیں اپنے ساتھ تصاویر بنوانے کی درخواست کی جو

انہوں نے قبول کر لی۔ میرا بے اختیار جی چاہا تھا کہ میں ان خواتین سے دریافت کروں کہ آخر انہوں نے پاکستانی لباس پہننا کیوں پسند کیا؟ جلد ہی ان سے تعارف کی صورت پیدا ہوگئی۔ ان دونوں خواتین کا تعلق انگلینڈ سے تھا، وہ پاکستان میں دو ہفتے کی چھٹیاں منانے آئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون کا نام Maggie Micholl تھا، اس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی، جسم ذرا بھاری پن کی طرف مائل، سبز کھلے شلوار قمیص میں یہ درمیانہ قد کی خاتون قدرے بھاری لگ رہی تھی۔ دوسری خاتون نے اپنا نام Janet بتایا۔ یہ قد وقامت میں نسبتاً دبلی پتلی اور چالیس برس کے قریب نظر آتی تھی۔ دونوں میں ایک بات مشترک تھی، کہ وہ دونوں بے حد با اخلاق تھیں۔ بات بات پر ایکسکیوزمی، کہنا ان کا شعار تھا اور ہم جیسے اجنبی لوگوں کی موجودگی میں بھی کافی با اعتماد نظر آتی تھیں۔ غالباً طورخم کی سنگلاخ پہاڑیوں پر انگریزی دان افراد کی موجودگی میں وہ خود کو کافی نارمل محسوس کر رہی تھیں۔

گفتگو کے دوران میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں مغرب میں شروع کی جانے والی فکری اور سماجی تحریکوں کے مطالعہ میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ میں مغربی تحریکِ نسواں کے ارتقاء اور مغربی معاشرے پر اس کے اثرات کے متعلق ایک جامع کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو ان کے چہرے پر خوشگوار حیرت دیدنی تھی۔ مجنی چیک پوسٹ پر ان برطانوی خواتین سے تفصیلی بات چیت تو ممکن نہ تھی البتہ باہمی دلچسپی کے حامل چند امور پر میں نے ان سے سوالات کرنے کو غنیمت جانا۔ عورتوں کے عالمی دن کے حوالہ سے میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ اس دن کو منانے کا اہتمام کیسے کرتی ہیں؟ سبز شلوار قمیص اور سفید دوپٹے میں ملبوس باوقار انگریز خاتون 'میگی' کے جواب نے مجھے ششدر کر دیا:

"We dont celebrate women's day on 8th March. We celebrate Mother's day on 25th February."

''ہم آٹھ مارچ کو خواتین کا یوم نہیں مناتیں، ہم تو ۲۵ فروری کو یومِ مادر، منایا کرتی ہیں''

''مگر برطانوی حکومت تو عورتوں کا عالمی دن ضرور مناتی ہوگی؟'' ایک حیرت میں ڈوبے ہوئے شخص کی طرح میں نے یہ ضمنی سوال کیا۔ محترمہ میگی نے یہ کہتے ہوئے میری حیرت میں مزید اضافہ کر دیا: ''انگلینڈ کی حکومت یہ دن نہیں مناتی۔ مختلف غیر سرکاری تنظیمیں البتہ اس کا خوب اہتمام کرتی ہیں'' میں حیران تھا کہ برطانوی حکومت عورتوں کے حقوق کے بارے میں اس قدر بھی پر جوش نہیں ہے جس قدر کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کی ایک لبرل حکومت جدید تحریک نسواں کے خلاف دو انگریز خواتین کی طرف سے بے زاری کا اظہار میرے لئے ایک درجن کتابوں کے مصنفین کے بیانات سے زیادہ قابل قدر شہادت تھی۔ ان سے ہونے والی گفتگو کو میں ریکارڈ نہیں کر سکا تھا، مگر اس جیتی جاگتی، مؤثر

شہادت کا کوئی نہ کوئی ثبوت میں اپنے پاس ضرور رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی وہ میرے ہمراہ ایک عدد تصویر بنوائیں۔ انہوں نے خوش دلی سے رضامندی کا اظہار کیا۔ تصویر بنوانے سے پہلے ایک دفعہ پھر یورپی آزاد معاشرے میں پلی بڑھی ان خواتین نے اپنے چادر نما دوپٹے درست کئے۔ ہمارے ایک ساتھی نے اس تاریخی شہادت کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرلیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں ان کی یہ تصویر اپنی کتاب میں شائع کروں گا۔ میرا سوال سن کر دونوں خواتین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سوال برطانوی اور یورپی ثقافت کے تناظر میں بڑا معصومانہ اور کچھ انہونا سا ہے۔ بہرحال انہوں نے اس کی اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے ہم سے اجازت چاہی تو میں نے یوں ہی دریافت کیا۔ ''آپ کی اگلی منزل کیا ہے؟'' انہوں نے بتایا کہ کل صبح وہ سوات کے لئے روانہ ہوں گی، ''وہاں آپ کا قیام کہاں ہوگا؟'' میں نے تجسس بھرا سوال کیا، کیونکہ اگلی صبح ہمارا پروگرام بھی سوات جانے کا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہوٹل وائٹ پیلس (سفید محل) میں قیام کریں گی۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ ہماری بکنگ بھی اسی ہوٹل میں ہے تو انہوں نے کہا ''یہ تو بہت اچھی بات ہے، آپ کے ساتھ وہاں اچھا وقت گزرے گا''۔ میں نے ان سے آخری درخواست یہ کی کہ سوات میں قیام کے دوران وہ کچھ وقت مرحمت کریں تاکہ ان سے برطانوی معاشرے کے مختلف پہلوؤں کے متعلق سیر حاصل گفتگو ہو سکے۔ انہوں نے وقت نکالنے کی حامی بھری اور الوداعی سلام کے بعد رخصت ہوگئیں۔

پشاور سے سوات کی طرف سفر کرتے ہوئے ان برطانوی خواتین سے ہونے والی ممکنہ ملاقات کا خیال ذہن میں آتا تو خوشی کا احساس گھیر لیتا۔ میں ان خواتین سے اس ملاقات کو تائیدِ ایزدی خیال کرتا رہا، کہ ان کے خیالات سے پاکستانی خواتین کو آگاہ کر کے انہیں این جی اوز کے فریب انگیز جال سے بچانے میں کافی مدد ملے گی۔ ۱۷ مارچ کی شام کو ہم ہوٹل وائٹ پیلس (سوات) پہنچے۔ یہ سفید محل درحقیقت والئی سوات کی موسم گرما کی رہائش گاہ تھی۔ یہ سیدو شریف سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر مرغزار کے خوبصورت پہاڑی مقام پر بنایا گیا ہے۔ ۱۸ مارچ کو ہم بحرین، مدین، کالام، گہرال کی برف پوش حسین وادی کو دیکھنے میں منہمک رہے، اس لئے برطانوی خواتین سے ملاقات نہ کی جاسکی۔ البتہ سفید محل میں آنے کے فوراً بعد میں نے ہوٹل انتظامیہ سے کنفرم کرلیا تھا کہ وہ مذکورہ برطانوی خواتین بھی وہاں قیام پذیر تھیں۔

یہ ۱۹ مارچ ۲۰۰۱ء کی بے حد دلفریب صبح تھی، سورج کوہ پہاڑ کی اوٹ سے نکل کر آنے میں قدرے وقت لگا تھا۔ ہلکی ہلکی نیم خنک ہوا کے جھونکے دل و جان کو معطر کر رہے تھے۔ سفید محل کا خوبصورت سبزہ زار دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ محل کی جنوبی دیوار کے ساتھ بہنے والی ندی کے نیم خراماں پانی کی خفیف سریں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ ایسے کیف آور منظر میں سفید جھیل کے سبزہ زار میں بنی ہوئی سنگ مرمر کی خوبصورت کرسیوں پر بیٹھا میں سوات کے دلکش مناظر اور فطری

حسن کی شاہکار برف پوش چوٹیوں کے متعلق اپنے تاثرات ڈائری میں قلمبند کر رہا تھا، کہ میں نے ان برطانوی خواتین کو قریب سے گزرتے دیکھا، میں نے انہیں ''گڈ مارننگ'' کہا تو انہوں نے اجتماعی آواز میں ''ہیلو، ہاؤ آر یو'' کا نعرہ بلند کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے انہیں تفصیلی گفتگو کا وعدہ یاد دلایا۔ انہیں ابھی تک یقین نہیں تھا کہ میں انٹرویو کے بارے میں اس قدر سنجیدہ بھی ہوں۔ سفید محل میں ''میگی'' اور ''جینٹ'' سے ہونے والے اہم سوالات و جوابات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

گفتگو کے آغاز میں، میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنا تفصیلی تعارف کرائیں۔ محترمہ میگی نے بتایا کہ وہ برطانیہ کے لوکل گورنمنٹ کے شعبہ میں چائلڈ کیئر سروسز (بچوں کی نگہداشت کے ادارے) کی انسپکٹر ہیں۔ ان کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے زیر نگرانی ان اداروں میں یقینی بناتی ہیں کہ وہاں بچوں کو خوراک، تعلیم اور صحت کے مناسب سہولیات مہیا کی جاتی رہیں۔ دوسری خاتون جینٹ کا تعلق بھی لوکل گورنمنٹ سے تھا، وہ ''یوتھ سروسز'' کی انچارج تھیں۔ یہ دونوں خواتین لندن میں جاب کرتی ہیں۔ میں نے ان سے پہلا باقاعدہ سوال یہ کیا کہ آپ تحریک نسواں کو ناپسند کیوں کرتی ہیں حالانکہ یہ تحریک عورتوں کے حقوق اور ترقی کی بات کرتی ہے؟ میگی نے اس کا جواب یوں دیا: ضروری نہیں ہے کہ ہر عورت جو بات کرے وہ عورتوں کے مفاد میں بھی ہو۔ فیمنسٹ عورتوں پر سب سے بڑا اعتراض ہمیں یہ ہے کہ وہ خاندانی اقدار کے خلاف بات کرتی ہیں، وہ باقاعدہ شادی کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ایک شادی شدہ عورت سیاسی اور سماجی معاملات میں بھرپور مساویانہ کردار ادا نہیں کر سکتی''۔ اچھا یہ فرمائیے تحریک نسواں کی علمبردار کہتی ہیں کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح ہر کام کر سکتی ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟'' یہ سوال سن کر میگی اور دوسری خاتون کے چہرے پر خاصی سنجیدگی طاری ہوگئی۔ اس سوال کا جواب بھی میگی نے دیا۔ ''دیکھئے ہم مرد بننا نہیں چاہتیں، ہم مرد نہیں بن سکتیں، یہ سیدھی سی بات ہے کیونکہ ہم مرد نہیں ہیں۔ مرد اور عورت کی برابری کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں اضاف Same بھی ہیں۔ ہم جو کچھ چاہتی ہیں وہ یہ ہے کہ عورتوں کو بھی اپنے دائرے میں ترقی کے برابر مواقع ملنے چاہئیں'' میرا اگلا سوال Single parents کے بارے میں تھا۔ ''کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ برطانوی معاشرے میں Single Parents کی پوزیشن کیا ہے، انہیں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور حکومت انہیں کہاں تک سپورٹ کرتی ہے؟'' اس سوال کا جواب دبلی پتلی برطانوی خاتون جینٹ نے دیا، جو ایسے خاندانوں کی مالی امداد کے شعبہ سے بھی وابستہ رہی ہیں۔ سب سے پہلے اس نے برطانوی معاشرے کی اخلاقی قدروں کی روشنی میں اسے بیان کیا۔ دیکھئے برطانیہ پروٹسٹنٹ اخلاقیات پر یقین رکھنے والا معاشرہ ہے۔ آج بھی برطانیہ کے مسیحیوں کی اکثریت بغیر نکاح کے کسی طرح کی شادی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ یہ بھی حالات کا ایک جبر ہے جو وہ برداشت کئے ہوئے ہیں۔ مزید برآں ''سنگل پیرنٹ'' خاندان زیادہ تر وہ ہیں جن کی ذمہ داری عورتوں پر ہے۔ حکومت اگرچہ تھوڑی بہت ان کی

امداد کرتی ہے مگر مہنگائی کے اس دور میں ان کا گذارہ مشکل سے ہی ہو پاتا ہے۔ برطانوی معاشرے میں درمیانہ درجہ کا معیار زندگی برقرار رکھنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی ماؤں کو شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ ویلفیئر سپورٹ کا حصول بھی دشوار ہے، سب لوگ اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتے۔''

برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں Peodophiles (بچوں کے جنسی جرائم) کا معاملہ بھی آج کل ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ میں نے اس بارے میں جب سے دریافت کیا، تو خلاف توقع ان برطانوی خواتین نے شرم سے نگاہیں جھکالیں۔ ان کے چہرے کی ناگواری ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس طرح کے کھلے سوالات کا جواب دینا پسند نہیں کرتیں۔ انہوں نے جب کچھ دیر کے لئے سکوت اور جھجک کا مظاہرہ کیا تو میں نے چند ماہ پہلے برطانیہ میں ایک آٹھ سالہ بچی Sara Pain کی ایک پیڈوفائل، کے ہاتھوں ہلاکت کا واقعہ بیان کیا تو میگی نے محض اتنا تبصرہ کیا۔ ''یہ انسانیت کے خلاف گھناؤنا جرم ہے۔ ایسے لوگ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہئے۔ مہذب معاشروں میں ایسے واقعات بہت پریشان کن ہیں'' اس مسئلے پر میں نے بھی مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے گفتگو کا رخ بدلنے کے لئے ان سے پوچھا۔ ''کہا جاتا ہے کہ مغربی ممالک میں خاندانی اقدار تباہ ہو چکی ہیں۔ خاندان زوال کے آخری کنارے پر ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ میگی جو بچوں کے متعلق سوال سن کر خاصی چھپ سی گئی تھی، فوراً ہی اس نے جواب دیا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ ہمارے معاشرے میں خاندانی اقدار کو کبھی زوال آیا۔ میں مانتی ہوں ہمارے معاشرے کا ایک حصہ خاندانی اقدار کو چھوڑ چکا ہے، مگر اکثریت اب بھی خاندانی اقدار پر یقین رکھتی ہے۔ میڈیا بہت پراپیگنڈہ کر رہا ہے۔ روایتی خاندانوں کے حالات کو بیان نہیں کیا جاتا۔ برطانیہ کا مطلب صرف لندن نہیں ہے۔ لندن سے ذرا دور چلے جائیں آپ کو خاندانی اقدار پر عمل جابجا دکھائی دے گا'' برطانوی خاتون کا یہ جواب میرے لئے بھی چونکا دینے والا تھا۔ کیونکہ ہم جو کچھ اخبارات، رسائل میں پڑھتے ہیں اور ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں، وہ میگی کے خیالات سے یکسر مختلف ہے۔ میں نے اس موضوع پر کچھ ضمنی سوالات بھی کئے مگر میگی اپنے مؤقف پر قائم رہی۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا آخر میری نگاہ میں خاندانی اقدار سے مراد کیا ہے۔؟ میں نے مختصراً وضاحت کی کہ میرے خیال میں ایک خاندان کے افراد میں باہمی محبت، ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا جذبہ، ایثار و قربانی، خاوند اور بیوی کے درمیان تصادم کی بجائے تعاون اور نکاح کے نتیجے میں استوار ہونے والے تعلقات۔ والدین، بہن بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کے درمیان باہمی اخوت و مودت کے جذبات وغیرہ۔ میگی نے وضاحت کی ''برطانوی خاندان اور آپ کے ہاں کے خاندان میں بنیادی فرق ہے۔ وہاں ''نیوکلیئر فیملی'' کا تصور ہے، جس میں صرف والدین اور بچے شامل ہیں۔ وسیع پیمانے پر خاندان کا وہاں تصور اب نہیں

رہا۔ اس خاندان میں ہمارے ہاں بھی ایک دوسرے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ آپ لبرل عورتوں پر مت جائیں، برطانیہ کی عام عورت گھریلو معاملات میں بہت دلچسپی لیتی ہے۔ اور بچوں کا بہت خیال رکھتی ہے'' میں نے کہا'' ہمارے ہاں بیویاں خاوندوں کا بہت خیال رکھتی ہیں'' اس پر میگی نے کہا میں بھی اپنے خاوند کا خیال کرتی ہوں۔ میں اور میرا خاوند دونوں ملازمت پیشہ ہیں۔ مگر روزانہ صبح اٹھ کر میں ہی سب کے لئے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔ بچوں کا زیادہ تر میں ہی خیال کرتی ہوں۔ باورچی خانہ میں ہی سنبھالتی ہوں۔ تو کیا آپ کے خیال میں خاوند کے ساتھ یہ تعاون کافی نہیں ہے؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنے خاوند کی غلام بھی ہو جاؤں، تو ایسا ممکن نہیں ہے'' ایک برطانوی عورت اپنے خاوند کا اس قدر خیال رکھتی ہے، یہ میرے لئے ایک نئی بات تھی۔ ہمارے ہاں کی روشن خیال بیگمات بھی اپنے خاوندوں کا اتنا خیال نہیں رکھتیں۔

مشرق اور مغرب کے حوالہ سے ایک اور مسئلہ عورتوں کی حفاظت کا ہے۔ مغرب کا لبرل طبقہ اسلام کو مورد الزام ٹھہراتا ہے کہ اس نے عورت کو چار دیواری میں بند کر رکھا ہے اور اس پر ترقی کے راستے نہیں کھولے جاتے۔ مغربی معاشرہ ایک مخلوط معاشرہ ہے، وہاں حجاب کی سختیاں ناقابل تصور ہیں۔ میں نے برطانوی خواتین کے خیالات اس موضوع کے بارے میں جاننے چاہے۔ ''اگر آپ اس کو برا نہ سمجھیں تو میں جاننا چاہوں گا کہ آپ کے ملک میں عورتوں کو اس قدر حقوق ملنے کے باوجود وہاں'' ریپ'' کے واقعات میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے'' میگی نے کچھ دیر سوچا اور پھر یوں گویا ہوئیں: ''آپ یہ بات مت بھولیں جہاں آزادیاں ہوں گی وہاں ایسے واقعات ضرور ہوں گے۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ انسانی جبلت کو بہت پروجیکٹ کرتا ہے۔ نوجوان نسل میں ہیجان خیزی میڈیا کی وجہ سے بڑھ رہی ہے۔ ہمارے ہاں عورتیں کافی حد تک آزاد ہیں، مگر پوری طرح محفوظ نہیں ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہاں عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے، نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہاں ریاستی ادارے عورت کو بہت تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں سوسائٹی عورت کا تحفظ کرتی ہے۔ بس یہ بنیادی فرق ہے۔ ہمارے ہاں اگر کسی عورت پر کوئی مجرمانہ حملہ کرتا ہے تو ممکن ہے ساتھ سے گزرنے والے افراد اس کی مدد کو نہ آئیں مگر ریاستی ادارے فوری حرکت میں آتے ہیں'' میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے ہاں تو خاندان کے افراد اپنی خواتین کے بارے میں اس قدر حساس واقع ہوئے ہیں کہ اگر کوئی ان کی عورتوں سے چھیڑنے کی جسارت کرے تو وہ اس کو گولی مارنے سے باز نہیں آتے۔ اس نے اعتراف کیا کہ برطانوی مردوں میں یہ جذبات اب نہیں پائے جاتے۔

برطانوی خواتین سے مذکورہ گفتگو کے دوران ایک برطانوی نوجوان Peter Square بھی شریک گفتگو ہو گیا۔ وہ انتہائی ہنس مکھ نوجوان تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے انجینئر تھا۔ کراچی میں وہ اپنی فرم کی طرف سے نمائندہ ہے وہ بھی سفید محل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے اس سے بھی چند سوالات کئے۔ اس نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اس نے عورتوں کے عالمی دن کے متعلق کبھی نہیں سنا۔ عورتوں اور مردوں کی مساوات کے متعلق جب اس کے خیالات پوچھے گئے۔

تو اس نے بے اختیار یہ جملہ اچھالا ''That is simply rubbish'' یہ بالکل لغو بات ہے'' اس نے وضاحت کی کہ مرد پیدائشی طور پر زیادہ طاقتور ہے۔ مرد شکاری ہوتے ہیں۔ برطانوی معاشرہ کو کافی حد تک مواقع دیئے گئے ہیں۔ مگر اب بھی وہاں ہر شعبے میں یہ اپنے اپنے مخصوص دائروں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ بہت سے ایسے کام ہیں جو اب بھی مردوں کے لئے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اب بھی برطانیہ میں عورتوں اور مردوں کی تنخواہ برابر نہیں ہے۔

مذکورہ بالا سوالات کے علاوہ بھی کئی باتیں ہوئیں جن کا تذکرہ اس مضمون کی طوالت کو مزید بڑھا دے گا۔ اس گفتگو کے آخر میں، میں نے ان برطانوی خواتین سے درخواست کی کہ وہ اپنے پتہ جات اپنے قلم سے میری ڈائری میں نوٹ کریں۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میگی نے کہا میں ابھی کمرے سے ہو کر آتی ہوں۔ وہ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک میگزین Community Care کا تازہ شمارہ تھا۔ جو اس نے مجھے اس خواہش کے ساتھ تحفتہً عطاء کیا کہ میں اس کا گہرائی سے مطالعہ کروں اور اس پر درج انٹرنیٹ کے ایڈریس پر جاؤں تو مزید معلومات حاصل کر سکوں گا۔

میں نے مہمان خواتین کا بھرپور شکریہ ادا کیا اور ان کی وسعت نظری کی تعریف کی۔

مذکورہ برطانوی خواتین سے ملاقات کے بعد میرا یقین پختہ ہو گیا کہ تحریک نسواں کی علمبردار عورتوں کی پر جوش متحرک اقلیت عام روایت پسند مگر خاموش عورتوں کی اکثریت کی ہرگز نمائندہ نہیں ہے۔ جس طرح پاکستان میں مغرب زدہ عورتیں عام پاکستانی عورتوں کی نمائندہ نہیں ہیں، بالکل اسی طرح یورپ میں عورتوں کی کثیر تعداد جدید تحریکِ نسواں کی حامی نہیں ہے۔ ہماری این جی اوز کی آزاد خیال عورتیں یورپ کی جس عورت کو ماڈل کے طور پر پیش کر رہی ہیں، اسے امریکہ و یورپ میں بھی احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے ہاں میگی اور جینٹ جیسی یورپی خواتین کے خیالات سے پاکستانی عورتوں کو آگاہ کیا جائے جو خاندانی اقدار پر بھرپور یقین رکھتی ہیں۔ این جی اوز کی برپا کردہ تحریک در حقیقت تحریک نسواں ہے۔ یہ تحریک فتنۃ النساء ہے جس سے خاندانی نظام کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ کاش کہ ہم ٹھنڈے دل سے سوچتے کہ عورتوں کے عالمی دن کو منا کر ہم کن عورتوں کے حقوق کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ☆☆

دعاءِ صحت

مجلس احرار اسلام کے مرکزی نائب صدر محترم چودھری ثناء اللہ بھٹہ صاحب

مجلس احرار اسلام سیالکوٹ کے صدر محترم سالار عبدالعزیز صاحب

مجلس احرار اسلام لاہور کے قدیم کارکن محترم حفیظ رضا پسروری صاحب اور آن کی اہلیہ محترمہ

احباب و قارئین ان کی صحت یابی کے لئے دعاء فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و سلامتی عطاء فرمائیں آمین (ادارہ)